

کنارے پچاتے ہوئے پتوں کا منتظر اسد کی نظروں کے سامنے بڑی دیر تک پھرنا رہا۔

پہاڑوں کی اونچی اونچی دو طرف دیواریں اب پیچے رکھنی لختیں۔ یہ عقداب کم ویش ہمار زمین اور جھپٹی بڑی پہاڑوں کا تھا جن کے نیچے ایک تنگ سادریا بہتا تھا۔ اب وہ دونوں باقاعدہ ہوئے رستے پر سفر کر رہے تھے۔ امیر خاں کو آگے چلنے کی خردت بھی نہ رہی تھی۔ کبھی وہ اور کبھی اسد چلتا چلتا آگے نکل جاتا۔ پہاں زمین نہ خیز تھی۔ چھوٹی بڑی چٹانوں کے عقاب میں مٹی کے ذخیروں پر آگے ہوئے خود روپ پھرلوں کے جھنڈے پھلا دوں کی طرح منہ نکال کر ہنتے ہوئے نوادر ہرتے اور دو قدم چلتے پر غائب ہر جاتے۔ دھوپ میں چلنے سے اسد کو سیدہ کرنے لگا تھا۔

” یہ علی کوں تھا ہے اسدنے پوچھا۔

” ہماراً ادمی تھا۔ مر گیا ہے۔“

” دُبِل تو نہیں تھا ہے۔“

” نہیں۔ ڈڑا سچا ادمی تھا۔ کیوں ہے۔“

” ایسے ہی پوچھا ہے۔ میں کسی ایسے بچتر میں نہیں چنسا چاہتا کہ نہ ادھر کا رہوں نہ ادھر کا، دونوں طرف کے ادمی میرے پیچے لگے ہوں۔“

امیر خاں اپنی خشک سنبھی ہنسا۔ ” ادھر کا تھا۔ ڈڑا سچا اور دلیر ادمی تھا۔ تھا آگئی۔ مر گیا۔“  
دھوپ دھلی توہرا میں مخملی روت آئی۔ ایک لمبی پہاڑی کے سلیے میں پہنچنے چلتے اسدنے چادر کا ایک پتوں نکال کر کندھوں کے گرد لمپیٹ لیا۔



سلطان شاہ کا کندوکی شکل کا اسٹرے سے متھا ہوا سرخا جو تیل سے چمک رہا تھا۔ وہ دریا نے قد اور گھٹھے ہوئے بن والا ادمی تھا جس کی سب سے نیماں تھے اس کی گردن تھی۔ پلے ہوئے نیل کی جڑیں

اور اُبھری ہوئی گردن کو دیکھ کر حکس ہوتا تھا کہ اگر یہ شخص (جنہیں کہ طرح) اپناؤں دار سر سیدھا کر کے دوڑتا ہوا آئے تو دیوار پھاڑ کر بخل جائے گا۔

غروبِ آفتاب سے کافی دو گھنٹے بعد امیر خاں اور اسد اس قبیلے میں داخل ہوئے تھے۔ قصبه چھوٹے مرٹے شہر کے سائز کا تھا اور سلطان شاہ کا مکان قبیلے کے سب سے گنجان آباد علاقے میں واقع تھا۔ سلطان شاہ نے دروازہ کھول کر خارشی سے امیر خاں کے ساتھ معاونت کیا اور اسد کے ساتھ اتنا طلبایا۔ مرے کے دریان پکھے فرش میں ایک چھوٹا سا گھاٹھا تھا جس میں چند لکڑیاں پڑی دیکھ رہی تھیں۔ گھر ڈھنکے گرد زین پر دو دریاں پھیجی تھیں۔

مکان نک کرنے کے لیے طویل تھریلی گلی کی چڑھائی چڑھتے چڑھتے اسد کی سانس پھول گئی تھی۔ اس نے سلطان شاہ سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنا نک کا دھیلا ایک دری پر رکھا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بھتی جوئی لکڑیوں کی حرارت اس کے تھانے کے کڑے ہوئے جسم کو بھلی معلوم ہوئی۔ دروازے کے پاس امیر خاں اپنے میزبان کے پاس کھڑا یاچی اداز میں بات کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد دونوں نے اسد کی جانب بیگانہ چینکی، پھر بات ختم کر کے سلطان شاہ نے اندر سے دروازے کی کندھی چڑھائی اور دوڑ آ کر دری پر بیٹھ گئے۔ امیر خاں نے نک کے ڈھیلے پر سر کھل کر اپس لیٹ گیا۔ سلطان شاہ پر ارتھنا کرتے ہوئے سادھوؤں کی مانند ٹانگیں سمیٹے، گھنٹے دایمیں بھیڑا سے بیٹھا تھا۔ اس بھارتی، ساکت انداز میں بیٹھا وہ پہلے سے بھی زیادہ ٹانگوں کی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ لمبا اور قشنگ تھا۔ اس کے مذہ پر کوئی بال نہ تھا۔ یوں غلتا تھا کہ اس کا سر، موچیں اور ڈار بھی ایک ہی اسٹرے سے، ایک ہی دلت بلکہ ایک بی وار میں صفا چٹ کر دیے گئے تھے۔ وہ امیر خاں سے آہستہ آہستہ کشیری میں باہمیں کر رہا تھا۔ یا میں زیادہ تو سرحد پار کی اور غیر اعم تھیں جن سے اسد کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔

دو دو چار چار منٹ کے وقت پر ہم اور افراد دروازہ کھلکھلا کر اندر دخل ہوئے۔ ہر بار سلطان شاہ کا مہیب جھٹ رُفت کے ساتھ اچک کر رہتا۔ اور اس سے پیشتر کر پاؤں پر جسم کو کھرا ہو، دروازے کے پیچے چکا ہوتا۔ تاہم اس کی چال ڈھال سے کبھی نامناسب عجلت کا حکس نہ ہوتا تھا۔ اس کے اطوار میں جنگل کے آزاد جانوروں کا ساتھی تھا۔ اُسے کرے میں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور باہمیں کرتے ہوئے دیکھ کر لمحظہ بمحظہ اسد کے دل میں یہ احساس مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ اس کے سفر کے دوران کہیں پر زوال الغفار کا اور امیر خاں کا علاوہ ختم ہو چکا ہے۔ اس جنگل میں اب اس کشیری کا انقیاب چلتا تھا۔ اسد نے دیہیں بیٹھے بیٹھے

ایک تیس سالہ عورت کو اندر و داخل ہوتے اور متناسط داخلاً خارج کے ساتھ کوئی بات کر کے، درمی پر بیٹھے ہوئے دو اجنبیوں کی جانب دیکھے بغیر، مکان کے پچھلے کمرے میں جلتے ہوئے، اور پھر دو ٹنڈ شکل کشیر لوں کو سلطان شاہ سے بات کرتے کرتے، ایک غیر مرمن اطاعت کے ساتھ میں داخلتے ہوئے دیکھا۔

آن میں سے ایک ارجمند عمر کا، گھنی سیاہ ڈار ڈھنی اور موچبوں والا شخص تھا۔ بالوں کی بے ترتیب اگاس کے نیچے اس کے چہرے کے نقوش قریب قریب اچھل ہو چکے تھے۔ لالیں کی اس مقدم روشنی میں بھی، دو گز کے فاصلے سے، اسد نے دیکھا کہ اس کی ناک کے نیچے کھڑے ہوئے موچبوں کے دو بال اُس کی سانس کے ساتھ اندر لودا بہر میں رہے تھے۔ ابھی ہر قی دراز محبتوں کے نیچے اس کی آنکھیں رخت اور چمک دلتھیں۔ یامیں کرتے کرتے وہ بار بار اپنے ڈھیلے کرتے کے گرد پیان میں ہاتھ دال کر پیٹ کو گھما رہا تھا۔ سلطان شاہ نے اسد کی طرف اشارہ کر کے اُسے متعارف کرایا۔

اور ایک غیر شخص جس کا نام غلام تھا، کھڑا درمی آواز میں بولا: ”علیٰ“ ساتھ ہی اُس نے سر کے ایک چمکے سے اسد کو اٹھتے کا اشارہ کیا۔ ایک ہاتھ وہ اسد کے کندھے پر رکھ کر، دوسرا ہاتھ سے پیٹ کھجاتا ہوا، اُسے دیوار کے پاس اُس جگہ لے گیا جہاں لالیں ٹنگی تھی۔ وہاں پر اُس نے اسد کو دیوار کی طرف رُخ کر کے کھڑا کیا، اور ایک اچھتی ہوئی نظر پچھلے کمرے کی جانب دال جہاں سے عورت کے چلنے پھرنے کی آوازیں آہی تھیں۔ پھر اُس نے ایک لختے کو سختی سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا اور سر کے مخقرے چھکے سے اُس کی ٹانگوں کی جانب اشارہ کیا۔ اسد نے جلدی سے پرستے کپڑا اٹھا کر مخوری کے نیچے دا با اور ازار بند کھول کر شلوار نیچے ڈھلاندی۔ غلام نے جگ کر معاشر کیا، پھر سر چاکر اُسے ڈھانپنے کا اشارہ کر کے ملجن سے سیدھا ہو گیا۔ اسد نے مخوری کو ڈھیل دی تو گردنہ نیچے گر پڑا۔ وہ دیوار کے ساتھ کھسک کر ازار بند ہاندھنے لگا۔ شلوار سیدھی کرنے کے بعد اسے دا پس درمی کے اوپر اپنی جگہ پر آ بلجھا۔ یہ ساری کارروائی چند ساٹھوں کے اندر تمام پا گئی۔

دوسرا اندر و داخل ہونے والا شخص ایک نوجوان تھا جس کے گول چہرے پر صفائی سے کمزی ہوئی موچبوں تھیں جو بہر کے گرد ڈھنک کر مخوری تک پہنچ گئی تھیں۔ اُس کی بڑی بڑی ملامہ نظر والی آنکھیں تھیں جو اُس کی ٹنڈ موچبوں سے مطابقت نہ کھلتی تھیں۔ اس جیز نے، اور اُس کے خفیت سے پھر لے ہوئے تھنوں نے اُس کے چہرے کو ایک عجیب سی بے قاعدگی عطا کی تھی جو دیکھنے والے کو ہمیں نظر میں اُس سے کسی تدریخانہ کو دیتی تھی۔ اسد کی ”شناخت“ کے دوران وہ نوجوان دروازے کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا ان دونوں کی طرف دیکھتا اور ہر لے ہر لے جبڑے ہلاتا رہا۔ جیسے کچھ چبا رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پچھلے کمرے

میں چلا گیا۔

”شاخت ضروری ہے“ سلطان شاہ نے اپنی دھمی آواز میں اسد سے کہا، اب ترایسا بھی ہونے لگا ہے کہ ان کے جاسوس بر الجلامس کو اکرہارے اندر آشامل ہوتے ہیں۔ مگر دھیان سے دیکھئے پرستت کا اور جھنکے کا فرق صدمہ ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے شاخت اور بھی ضروری ہو گئی ہے۔“

اسد نے اُس کی تائید میں سر ہلایا۔ چوری سی نگی مہمی والی عورت پاٹ قدموں سے چلتی ہوئی پھلپے کرے سے نمودار ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ میں چاء وانی اور دسرے میں مشی کے پانچ پانی نے جو ایک دوسرے کے اندر جتے تھے، انھائے ہوئے تھی۔ سلطان شاہ نے پیاروں کا چھوٹا سا مینارہ عورت کے ہاتھ سے لے کر اسی طرح زمین پر کھڑا کر دیا۔ پھر اُس نے ایک ایک پیالہ انھا کر چائے سے بھرنا شروع کر دیا۔ جب چاروں کے انھوں میں بھرے ہوئے پیلے جا پکے اور درہی پر کھڑا ہوا پانچواں پیالہ بھی بھرا گیا تو عورت غالی چاء وانی لے کر واپس پھلپے کرے میں چلی گئی۔ چند سینکڑے کے بعد نوجوان رُنگ کے نے کھڑی کا ایک گول سا بتن لا کر درہی پر رکھ دیا۔ تھال کشمکش، بادام، اخروٹ کی گرمی اور خشک خوبائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ رُنگ کے نے پانچواں پیالہ انھا یا اور درہی کے کنارے پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

”ریاض میرا بھتیجا ہے“ سلطان شاہ نے محقرہ اس سے نوجوان کا تعارف کرایا۔ ریاض اُس کی طرف رکھے بغیر چائے پیتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے کرے میں مکمل خاموشی ہو گئی۔ پانچ بھر کے جڑے مصبوطی سے خشک میوے کو چبار بھتے تھے۔ کھانے والوں کے چہروں پر ایک بعیب منی کا عالم تھا۔ یوں معلوم ہوا تھا کہ زندگی کی قوت سے پُردہ پھل اور میوے، دانتوں کے نیچے پس پس کر اور زیر زبان اُبل اُبل کر ملکتے ہوئے ناعاب میں کیس جان ہو کر حلق سے ڈھلتے اور جیا تین کیلے میں سیدھے خون کی شربیوں میں اترتے جا رہے ہیں۔ نیچے نیچے میں امیر خان اور غلام پیالہ منہ سے لگا کر اونچی اونچی سُر کریوں میں الائچی والی نمک دار بزرگ چائے پی رہے تھے۔ اس نے اپر ملے چھٹا خشک خوبائیاں چاہیا کر کھائیں اور گرم منہ سے دار چائے کا گھونٹ بھرا۔ خوبائیوں کی تُرش شیرنی نے اُس کے تھوکاٹ اور بہشتہار سے چور بدن میں کیک بہر دوڑا دی۔ ریاض نے درہی پر پڑی ہوئی خوبائی کی چند گھٹھلیوں میں سے ایک انھا کر اپنی ڈار ھوڑوں میں رکھی اور اسے توڑ کر اُس کی گرمی چبانے لگا۔ گھٹھلی کا چھلکا اُس نے تھیل میں تحرک کر سلگتی ہوئی لکڑیوں پر پھینک دیا، جہاں پر وہ کچھ دیر تک دھوکا دینے کے بعد بھرک کر جل انھا۔ دوین نخے نہیں نیلے اور بزرگ شلے چند سینکڑے کے بعد بچوگئے۔ سلطان شاہ اور غلام نے دوبارہ دھیے سے لپجھے میں پائیں شہزادے کر دیں۔ اس نے کچھ دیر تک کان لگا کر سنسنے کر کشش کر۔ مگر ان کی بانیں مشترذاقی

اور متعامی نوعیت کی تھیں۔ اسد کا جی چاہ را تھا کہ وہ دری پٹانیجیں بچلیا کر، نک کے ذیلے پر سر رکھ کر سوچانے اُس کا ذہن و قلب پر خالی ہو چکا تھا۔ وہاں پر بیٹھے بیٹھے، وقٹے وقٹے پر اُسے محسوس ہو را تھا کہ جیسے کوئی چیز چھوٹ گئی ہے، پیچھے رہ گئی ہے۔ مگر اُسے پتا نہیں چل رہا تھا۔ لکڑیاں جل جلی تھیں اور دیکھتے ہوئے کوئی آہت آہتہ را کہ میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ ریاض برابر خوبیوں کی گھنیمتوں کو دانتوں میں توڑ توڑ کر ان کی گریاں کھارا تھا گھنیمتوں کے چکنے اپ وہ میکھلی میں جمع کرتا، پھر جگہ کر جھنسی ہوتی لکڑیوں پر پھنسک مار کر راکھ کی موٹی چلد اڑاتا اور نیکے کوئے پر آہتہ سے چھپکوں کی ڈھیری لگا دیتا، جہاں پر وہ دیر تک دھواؤ دہتے رہتے۔ کہے یہ میں ان کا دھواؤ بچیتا جا رہا تھا۔ وہ ایک بار سلطان شاہ نے باہم کرنے کرنے اتنا اٹھا کر ریاض کو ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے چھپائی بات پر دھیان دیے بغیر اپنے شغل میں مصروف رہا۔ بادام چھوڑ کر، اسد نے بے خیالی سے سوچا، یہ خوبی کی گریاں کیوں کھا رہا ہے؟

جب چارے کا دوسرا بیار بخی ختم ہو چکا تو وہ اٹھ کر ہوئے۔

”غلى،“ سلطان شاہ پولا۔ ”ریاض کے ساتھ چلے جاؤ۔“

”کہاں؟“

”گھر۔“

رات آدھی گزر پلی تھی اور ان کے پاس لاٹیں نکل نہ تھی۔ قبیسے کی آونچی نجی گھپ اندھیری گھنیمتوں میں وہ دونوں آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ اسد اگر چہ ریاض سے ایک قدم پیچھے تھا اور ریاض نے ایک مرتبہ بھی مرکز کر نہ دیکھا تھا، مگر اسد کا یہ احساس دم دم پڑھا جا رہا تھا کہ نوجوان رکے کی ٹھیکیں اُس پر گئی ہیں — کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اُن کے احاطے سے باہر نہیں گیا ہے۔ مالم نظر والی اُن آنکھوں نے اندھیرے میں ایک چمک دار شدی اختیار کر لی تھی جو اُس کو چھیدے جا رہی تھی۔ یہ کون ہے ہے میرا شمن ہے ہے بچھے کہاں لے جا رہا ہے ہے بگھر ہے اُس نے ذہن پر زور دے کر اس قبیسے کے نام کو یاد کرنے کی کوشش کی، مگر اُس وقت ہم اُس کے ذہن میں نہ آیا، حالانکہ دوالفقار کے کیمپ سے روانہ ہونے سے پیشتر، ہی اسد کو اُس ان دیکھنے قبیسے کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ اسد کی آنکھیں ایک تار اپنے تاریک رہبر کی پشت پر گلی تھیں اور وہ ناہوار نہیں پر آئئے سیدھے پاؤں رکھتا چلا جا رہا تھا۔ ہو گئے اس عالم میں بیکا یک ہے محسوس ہوا جیسے وہ گشہ میں چلا جا رہا ہے کہ جیسے یہ کوئی دوسرا لمحہ اور دوسرا قبیسہ نہیں بلکہ گشہ کی گھیاں اور دُبی اندھیرے خاموش مکان ہیں۔ اسد نے بے خیالی کے اس احساس کو گذانے کی خاطر سر کو ایک بار آہت سے جھٹکا۔ ریاض کے سر کی پشت پر آنکھیں گلی تھیں جو اُسے تارہ ہی تھیں۔ اس

کیفیت نے اُس کے اندر بے دخلی کے احساس کو تیز کر دیا، جیسے دنیا کے واقعات اپنے محور سے فراسا ہٹ گئے ہیں اور چینیں فراسی بے محل ہو گئی ہیں۔ جیسے کوئی اہم شے شاید چھپٹ گئی ہے۔  
”علیٰ“ ریاض نے مودود کو بولا۔

اس کی آواز پر اس طرح اچھلا جیسے سچل کی تار سے چھو گیا ہو۔ ایک بھجنچالی لمحے میں دنیا کھٹ سے گریا اپنے محور پر دلپس آگئی، اور باقیں کی سچان دہان سے بھل کر آئی.....  
سب سے پہلی بات یہ کہ رات بھر میں پہلی بار ریاض نے مرنہ کھولا تھا۔ اُسے اڑتی ہوئی سی حیرت ہوئی کہ پہلے اُس سے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا؟  
آواز رُکے کی تھیں کی مانند طائف اور دستیاز تھی؛ ”تمہارے پاس موٹی چادر ہے ہے“  
”نہیں۔“

”رات کو سردی ہو جاتی ہے۔“

”کوئی بات نہیں،“ وہ جلدی سے بولا، ”میں سو جاؤں گا۔“ وہ رُکھ رہا تا ہوا گلی کاموڑ مڑ گیا۔  
دوسری بات پر کہ اب وہ بلاشک علی تھا۔ ذوالغفار نے اور امیر خان نے اور سلطان شاہ نے مختلف اوقات میں متعدد بار اُس کو پکارا تھا، مگر ریاض کی طائف اور سرسراہی کو اواز نے جب اُس کا ہم لیا؛ ”علی“ تو وہ چونک رات کے اونچیرے میں آئی سیدھے پاؤں رکھتے ہوئے وہ اُس آواز پر بالآخر اپنی شخصیت کی عد پا کر گیا۔  
اب وہ اپنے دخود کے اُس گنم خلٹے میں داخل ہوا تھا جو کسی کی ملکیت نہ تھا۔ ساری شام وہ ایک بے سچھ مکح چاق دچرپند جا فر کی مانند ایں آئے والے خطرے کو محسوس کر کے چھڑ کر رہا تھا جب اُس کی زین بھس نے یہاں تک اس کا ساتھ دیا تھا، اُس کے نیچے سے سرک جائے گی اور وہ ثناسائی کے دائرے سے مکمل جائے گا۔ اُس کے نہ کہ بے دخل مکمل ہو چکی تھی۔

تاریکی میں لا شور ہی طور پر اُس کی چال بدل گئی۔ اُس کے کندھوں کا جھککاڑ، اُس کی گردن کی آنکان، اُس کی کمر، اُس کے بازو جواہیں لپنی جگہ سے بے معلوم طور پر گویا بال برابر سرک گئے۔ اس ہالموم سرزین پر اس نے طور نے اُس کے دل میں اعتماد اور آزادی کا عجیب سماحتکار پیدا کیا۔ اُس نے ریاض کے سرک کی پشت پر دیکھا۔ آنکھیں دیہیں تھیں، مگر اب اُن سے اُسے خوف محسوس نہ ہوا۔ اس عجیب و غریب خلٹے پر سب روپید اور سمجھی کچھ نہ معلوم تھا۔ اب وہ نئے سے سرے سے جو کس ہو رہا تھا.....

تیسرا بات یہ کہ اس قبصے کا نام باڑہ تھا۔ اُسے یاد آگیا۔ باڑہ سے باہر نکل کر وہ کرنی پوں میں تک پہنچتے رہے۔ اس راستے میں اُڑائی کم اور چھٹھائی زیادہ پڑی۔ اُفرادہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اُگے ہوئے جنگل میں پہنچنے۔ یہاں پر گھپل اندھیرا تھا اور درختوں میں ہوا پھل رہی تھی۔ زمین پر اُگی ہوئی جھاڑیوں کے پیچے ایک پتلا سارستہ جاتا تھا جس پر ریاض آسانی سے چلا جا رہا تھا۔ اپنے اس محض سے سفر کے دران ریاض نے اُسے بتایا کہ سلطان اُس کا چھپا ہے اور خشک میرہ جات کی ایک دکان کا مالک ہے جو باڑہ کی منڈی میں واقع ہے۔

”چاہا انفرنس کا آدمی تھا ساری عمر سے：“ اُس طالم آواز نے بتایا۔ ”جب کا ملکیں کی حکومت نے کافرنس کو دبادیا تو چاہا بدلتا ہو گیا۔ یعنی مرتبہ چھپھی ہئی کی جیل کا شہر کا ہے، مگر کرنی جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ پرانا آدمی ہے：“

درختوں کا ذخیرہ پتلا ہوتے ہی اندھیرے میں سے ایک بھی سی دُلچھوٹی شکل کی دیوار انجھری۔ اسد کی آنکھیں اندھیرے سے شناسا ہو چکی تھیں، مگر چھر بھی اُسے اس دیوار کی صحیح نویت کا تعین کرنے میں دقت ہوئی دیوار کی میں سے اونچی اور کمیں سے نیچی تھی، جیسے کہ کسی بھے بُر شخص نے یا بہت سے بچوں نے مل کر تعمیر کی ہو۔ جہاں پر دیوار ختم ہوتی تھی وہاں چون کا یہ محض سامیدان بھی ختم ہونا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ قریب پہنچ کر ریاض مڑا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اچک کر دوسرا طرف دیکھا۔ دیواری الائچے چون کے کنارے پر بنی تھی تاریکی کی وجہ سے وہ گہرا ایک ادازہ لگانے سے فاصلہ، بس اتنا اُسے نظر آیا کہ دیوار کے ساتھ ہی ڈھلان شروع ہوتی تھی۔ کوئے پر پہنچ کر وہ دوفوں بیٹھ بیٹھ کر پہاڑ کی سیر ہیاں اُڑنے لگے۔ دیوار ساتھ ساتھ پیچے کو جا رہی تھی۔ چند سیر ہیاں اُڑنے کے بعد دیوار میں ایک نشکاف نظر آیا۔ یہ نشکاف ایک ڈھلوان صحن کا دروازہ تھا دیوار جس کا احادیث کیے ہوئے تھی۔ دونوں اُس نشکاف سے گزر کر احادیثے میں داخل ہوئے۔ احادیث پہاڑ کے پہلو میں بنی ہوئی تھری سیر ہیوں کی شکل میں اور سے نیچے کو جاتا تھا۔ احادیثے کے ایک کونے میں ایک کرہ بناتھا۔ ریاض اور اسد اچک اچک کر سیر ہیاں چڑھتے ہوئے کہنے کے دروازے تک پہنچے۔ کوڑا کے پاس ایک گائے بندھی تھی جو انہیں دیکھ کر آنکھ کھڑی تھی۔

”یہ تھدا گھر ہے؟“ اسد نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ریاض نے کہا۔

ریاض نے کوڑا کھولا اور دوفوں اندر داخل ہوئے پنجی دیوار پر ایک لالیں ٹنگی تھی جس کی تھی تہبٹ پیچی کر دی گئی تھی۔ مگر تاریکی سے آئی ہوئی آنکھیں اس حصہ کے میں بھی کرے کی دیواروں اور پیشتر چیزوں کو دیکھنے

کے قابل تھیں۔

کمرے کا فرش پہاڑ میں بنی ہوئی تین چوری پتھر میں پسٹل تھا جس سے کمرے کی قدر تی  
حد بندھی ہو گئی تھی اور وہ ایک کی بجلتے تین کروں کا کام دے رہا تھا۔ ہر ایک پتھر سے آٹھ فٹ چورے  
زینے والی اور تین فٹ کے قریب اونچی تھی۔ بیانی کے رخ پتھر ہیاں اسی زینے کی شکل میں چلتی، دیوار میں  
سے نکل کر باہر دوڑتا کپڑی گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک مقام پر بے تدبیر دیوار چڑھنے کی گئی تھی جس سے  
کردکھڑا ہو گیا تھا۔ ایک پتھر سے دوسری پر اتر نہ کی انسان کے لیے بڑے بڑے کمپ پتھر کے ہوتے تھے،  
چنانچہ کمرے کے اندر ایک سرے سے دوسرے تک جانے کے لیے چھلانگیں لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ پہلی  
پتھر پر دو آدمی سرخ چھینٹ کے پتے لحاف اور یہ سہی تھے۔ ریاض اور اسد کے اندر داخل ہونے پر دونوں  
سو نے والوں نے سراٹھا کرنا شیش دیکھا اور پھر لحاف اور ڈھونگئے۔ دوسرے زینے پر چند چیزوں بھری پڑی تھیں،  
جن میں کپڑوں کی ایک گھری، دو پھاڑتے، ایک ک DAL، موٹے رستے کا بنا ہوا جال جوان علاقے میں نکلیوں کا  
لہاٹھانے کے کام آتا تھا، ایک منی کا ٹوٹا وغیرہ تھا۔ وہیں پر ایک چڑھتے کی بیٹی جو غوما پلوں پر باندھنے کے کام آتی  
ہے دیوار پر لگکی ہوئی ان دوسری چیزوں کے درمیان عجیب سی وکھائی دے رہی تھی۔

تمیری پتھری پر دیکھنے سے آخر معلوم ہوتا تھا کہ یہ کڑا ایک گھر ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک چڑھا تھا جس پر پہلی  
رکھی تھی، چند منی کی رکابیاں پاس زمین پر پڑی تھیں۔ روپے کی ایک گاگر، پانی پینے کا گلاس، اور متند و گھریلو اشیاء تھیں۔  
ایک طرف منی کی دوہیں بری بڑی مرتبان نما چاٹیاں رکھی تھیں۔ دوسری طرف کرنے میں کوئی لحاف میں لپٹا ہوا سورا  
تھا۔ آن دونوں کے آنے سے لحاف میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ اسد پہلی پتھری پر گھر رہا۔ ریاض نے نیچے جا کر لا لیٹیں  
کی بھی اونچی کی اوپریلی میں نظر والی۔ "چاول ہیں۔" وہ سرسری لیجئے میں بولا۔ اُس نے منی کی دو رکابیاں اٹھا کر نہیں  
پانی سے دھویا، اور پہلی سے گلیلی کیلی رکابیوں میں چاول اٹھیں کر پتھر دیں پر پاؤں رکھتا ہوا اور پر چڑھا یا۔ اُس نے  
ایک رکابی اسد کے حوالے کی اور زمین پر بیٹھ گیا۔

سینید چاول سرو ہو کر ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے اور دو تو دوں کی شکل میں اُن کی رکابیوں میں پڑے تھے۔  
اسد اسے لمتحس سے توڑ کر کھارا تھا جب کہ ریاض پورے کے پورے تو دے کو اٹھا کر اسے دانتی سے کاٹ کاٹ  
کر چا رہا تھا۔ پتھری ٹکلی نمیں اور بد مرد تھی، اگر اسدا سے ہش تھا دو سے کھارا تھا۔ تاہم چند زوالوں کے بعد خشک چاول  
اُس کے حلقی میں پھنسنے لگے۔ اُس نے رکابی زمین پر رکھی اور نیچے جا کر پانی کا ایک گلاس پسا۔ پانی تھنڈا اور فرے سے دار  
تھا۔ چالی گلاس کو اُس نے دربارہ گاگر سے بھرا اور لے کر اپنی جگہ پر آیا۔

” یہ کون ہیں ہے اسد نے سر کے اشارے سے پوچھا۔

” اپنے لوگ ہیں ہے ”

ریاض کی طالعہ آواز اور ہربات میں اس کا انہائی سرسری لجھے اب اسد کے دل میں کھٹکنے لگا تھا۔ پہلے پہل جس آواز اور جس لجھے نے اس کے دل میں ہلکا پن اور آزادی کا احساس پیدا کیا تھا، اب اسی آواز اور لجھے کی بیکا نیت اسے خوفزدہ کرنے لگی تھی۔ وہ اب کچھڑی کے تذمیر کے اس حصے کو کھارہتا تھا جس میں نک بالکل نہ تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس نے جھنچلا کر سوچا، کہ کچھڑی کے بیک حصے میں نک موجود ہو اور دوسرا میں نہ ہو۔ بے مزہ خشک چادلوں کو چاچا کر انہیں تعاب سے تذمیر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اچانک اسد کو فضای میں ایک عجیب سی بے تریبی کا احساس ہوا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز اور تھا، اس کے جڑوں کی حرکت غیر مانوسی تھی۔ کھانے کی چپ چپ آواز بہت اُپنچی تھی، یا اُپنچی اور پچی تھی۔ اس کے دخروں کا پرانا، مافس لوازن مدل رہا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے، وہ یہاں پر کیسے آن پہنچا ہے؟ اس نے ریاض کی طرف دیکھا، پھر سوئے ہوئے لوگوں پر نظر ڈال۔ یہ کون لوگ ہیں، اس نے سوچا، میں یہاں پر کیا کر رہا ہوں ہے میرا طور، میرا طریقہ، اس نے چاروں طرف نظر ڈال کر کوئی تھا، مگر نہ پھر کوئی تھا نہ مستطیل۔ دیواریں فرش کے زینوں کے ساتھ تبدیل یونچے کو چلی جاتی تھیں اور ایک دوسری کے ساتھ مختلف زادیے بنالی ہر قسمی متعلق تھیں، جس سے کمرے کی شکل تڑے تڑے گتے کے قبیلے کی مانند ہو گئی تھی۔ یہ میرا گھر ہے، اس نے ماپسی سے سوچا۔ اب کب تک یہ میرا گھر رہے گا؟ جب ریاض نگھنی میں سے ایک متعلق چھپ نکال کر اسے دی اور خود بتی بھا کر اپنی ماں کے قریب لیٹ کر سوگی۔ تو ہمیں سیری ہے پہنچے اسے قریب کئے ہوئے دو آدمیوں کی بھاری سانس کی آواز سنی۔ یہ اپنے لوگ ہیں، اس نے ماپسی سے دل میں وہ رہا۔ اس کا دل نگھن سے چڑھتا۔ نیزد سے اس کی آنکھیں جب بند ہوئیں تو چندی کے کامنے اس نے ایک عجیب متقد کیا، جیسے لپٹے تازہ مانا چھوڑے ہوئے محکماں شکاف اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ ہر بیس کوئی ہوں؟ اس کے اندر سے ایک گھری مبتلا آواز آئی۔ میں کیا ہوں؟

پھر نگھن اس پر غالب آگئی۔

(۸)

صبح سیرے اسے اٹھا تو تردد تھا۔ رات جو دادمی اُس کے قریب سوئے ہوئے نبھتے چاہکے تھے۔ بیاض کی ماں پڑھنے کے گرد کھٹ پٹ کر رہی تھی۔

”علیٰ“ اُسے جاگنے دیکھ کر بورجی عورت تیرپاکیک آواز میں بولی، ”میرا بیبا بھی آتا ہے۔ کچھ کھاپل لو۔ تم بھارہ تو نہیں؟“

”نہیں“ اسدنے کہا۔

”نیند میں تمہارا سانش وک رہا تھا۔“

”ماں۔“

”بیس پیدے سنتی رہی کہ کس کا ہے۔ پھر میں اپنے بیٹے کے نہ پر اتھ پھر کرو اور پائی۔ پھر مجھے پتا چلا۔ بیس نے کہا تھکلات تھا رے یعنی پر بیٹھ گئی ہے۔ بیس نے تھا رے منز پر بھی لامتحہ پھرا تھا۔“ وہ ننگی، ”نہیں پتا چلا تھا ہے۔“

”نہیں؟“ وہ بولا، ”میرے سانش میں فراہی ہے۔“

”تم سیدھے پڑے تھے۔ بیدھے سونے سے گلابی ہو جاتا ہے۔ کیا غرباً ہے؟ تمہیں دو رونہیں پڑا ہے؟“  
”لہٰ۔“

وہ کہڑی می پستہ قدم چھرے والی بڑھا ایک لختے کو اُس کے سامنے رک کر اپنی چھوٹی چھوٹی ٹیز انگھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ بڑھیا کی نظرؤں میں تشریش تھی۔ ریاض کے چھرے پر اُس نسبے خیالی سے سوچا، اپنی ماں کا کوئی نقش نہیں۔ بڑھیا اب کوئے میں ایڑیاں اٹھتے، چانل کے مژہ میں جھکی اس کے پنڈے میں اعتماد رہی تھی۔ مخورڑی دیر میں وہ دہان سے ایک مشی کا کوزہ نما بڑن لیے مروارہو۔

”یہ دو۔“ وہ گزرے کے ٹھنڈے پہنہ حاہرا کپڑا کھوتے ہوئے بدل، ”شہد سے سینہ صاف ہو جاتا ہے۔“ اُس نے سرعت سے کوزہ فدا سا آٹھیلا اور سہدھا کر لیا۔ شہد ایک بڑے سے بڑے کی شکل میں اسد کے دودھ بھرے گلاس میں گرا اور اُس کا باہریک تار ہوا میں لکھنے لگا۔ ریاض کی ماں نے اُسی سرعت کے ساتھ شہد کا گار اپنی انگلی پہ پیٹھا اور انگلی اسد کے مژہ کے آگے بُھادی۔ اسد نے ایک لختے کو جھپک کر اُس خشک کھڑی نما انگلی کو دیکھا، پھر اُس نے مُذکول کر شہد لگنی انگلی پر سلی۔

”میں اس کو مُذہب نہیں لگاتا۔ مجھے تخلیق دیتی ہے۔ مگر سوہنے کا پوک کی دو اے۔ ریاض کے باپ کو بھی سانس کا مرش تھا۔ اُسے شہد سے افاقت ہوتا تھا۔ ملکر کوئی بات نہیں۔ اس مرش سے کوئی نہیں مرتا۔ بس لمبارض ہے، دُکھ دیتا رہتا ہے۔ سانس جو ہوا۔ تمہیں دو دُکھ ہوا ہے؟“

”لہٰ۔“ اسد نے کہا، ”مگر سخت نہیں۔ گُز جائے گا۔“

وہ شہد ملے گرم گرم دودھ کو گھوٹ گھوٹ پی رہا تھا۔ بڑھیا نے کھنی کی بھبر بھری روٹی کا ایک بُکڑا، جو اُس نے تو سے پڑا کر ابھی ابھی گرم کیا تھا، اُس کے ماتھ میں لا تھا۔ وہ روٹی کو دانتوں سے کاٹ کر دودھ کے ساتھ کھانے لگا۔

”میرا بُجھا اپنے چھاکی طرف گیا ہے۔“ ریاض کی ماں اُس کے قریب زیست پر جھکر اُسے بتانے لگی، ”اذ جیرے اندھیرے ان دو آدمیوں کو کے کریل پڑا تھا۔ یہ سر بیگرے آئے ہیں۔ دن دن میں جانے میں پکتے ہیں۔ مگر سلطان کا گھر مخفوظ چکہ پر ہے، ایسکردن آدمی ہر دن پھر تے رہتے ہیں، شہر کے اندر کوئی خطرہ نہیں۔ ہمارا گھر اکیل چکر پر ہے، دُور سے جاسوسی ہر سکتی ہے۔ مگر خیر۔ سلطان کہتا ہے وہ اب پڑا اگیا تر پھر باہر نہیں آئے گا، سارا کام خراب ہو جائے گا۔ میں کہتی ہوں خیر۔ میں ریاض کے باپ کو منع کیا کرتی تھی۔ ریاض کا باپ سلطان کا بڑا بھائی تھا۔ دلوں بھائی حکمران کے مخالف تھے۔ اصل آدمی تو ریاض کا باپ تھا، سلطان تو چھوٹے بھائی کی طرح اُس کے چھپے چھپے لگا رہتا تھا۔

اب سوار بن گیا ہے۔ یہیں کہتی ہوں خیر، ریاض کا اپنا خون ہے۔ ان کے خاندان میں بغاوت کی رسم ہے جب میرے اپنے نے میری بخادی تو ہمارے خاندان میں سوگ پڑ گیا تھا، لوگ کہتے تھے عبده اللہ اپنی بیٹی باغیوں کو بیاد کر دے رہا ہے۔ آفروری ہوا جس کا در تھا، ایک دن ایسا غائب ہوا کہ پھر آئا۔ کوئی کہے چھپ گیا ہے، کوئی کہے پولیس پکڑ کرے گئی ہے۔ یہیں نے پیس تیس کوں تک لیکیں پیک پیک پھر کوڈ ٹھنڈا لایا پس کے پاس گئی، تھیصلدار کے پاس جاتی رہی۔ سلطان چھپ ہیٹھے کاٹ کر واپس آگئی، ریاض کا باپ نہیں آیا۔ دس برس ہو گئے ہیں۔ ایسا گفتا ہے ابھی اس مرداز سے سے داخل ہو گیا اور یہاں اکر کر میرے پاس بیٹھ چاہئے گا۔ یہ گھر اُس نے اپنے مانشوں سے بنایا تھا۔ وہ سانس لینے کو لیکی۔ اسد نے گھوٹ خالی کر کے زین پر مکھا اور بُر جمی عورت کے چہرے پر نظر والی۔ اُس کل آنکھوں میں آنسوؤں کا نشان تھک نہ تھی، نہ سرت زندگی کی خفیضت سی ہر سال کے آثار تھے۔ جب ریاض جوان ہوا تو اپنے چھپ کے ساتھ گک گیا۔ یہیں کیا کر سکتی ہوں۔ مردوں کے ساتھ تو جگہ اسی ہو سکتا ہے، جیلوں کے ساتھ یہیے ہو سکتا ہے۔ مرد جائیں بھی تو نامم پچھوڑ جاتے ہیں۔ یہ گھر اُس کے نام سے آباد ہے۔ بیٹھے چلے جائیں تو کچھ بھی پھر کرنہ ہیں جاتے۔ پھر اب اتنی عمر کے ساتھ مجھے بکھر آئی ہے۔ میرا بیٹا اپنے بیپ کی طرح اور دادا کی طرح مزدوری کرے گا، اور ایک روز میری طرح بُر جفا ہو جائے گا۔ «عورت نے دیران نظر سے گھر کی دیواروں پر کو دیکھا۔ پھر کیا کرے گا؟» اُس نے پوچھا۔

اسد نے سر بلکہ اُس کے سوال کا جواب دیا۔

«پھر کیا کرے گا؟ یہ بڑھیا نے دھر کر پوچھا۔ «یہیں کہتی ہوں خیر، بغاوت، اس کے خون میں ہے، مزدوری کرنے کے لیے زیادتی عُمر پُری ہے۔ تم بھی اسی کام کے لیے یہاں آئے ہو، دوسرا طرف سے۔ مجھے معلوم ہے، میرے گھر میں بیٹے کی طرح رہنے نکر کی کرنی بات نہیں۔ تمہیں کتنی عُمر سے سانس کا مرض ہے؟»

«دو یہیں سال سے ہے۔» اسد نے کہا۔ «یہیں ایک بولی کی تلاش میں ہوں جس سے مجھے افاقہ ہوتا ہے۔

«کون سی بُوفی ہے؟

«ہم مجھے معلوم نہیں۔ بگو مجھے اس کی پہچان ہے۔ ما تھکی سکل کا۔» اُس نے پانچوں انگلیاں بچھلای کر پڑھیا کو روکھا۔ اس کا پتا ہوتا ہے، اس علاقتے میں ملتی ہے۔

«تمہیں ہے۔ یہ علاقہ جڑی ہوئیں کے لیے مشہور ہے۔ ضرور مل جائے گی، نکر د کرو۔»

«میرے پاس ایک عورت کا پتا ہے۔ اُو حصہ سے لے کر آیا ہوں۔»

«کہاں رہتی ہے؟»

«چار کوسر۔»

"ماں۔ بیسی علاقوں پر۔ ریاضن تھیں لے جائے گا۔ یا میں لے جاؤں گی؟"  
وہ پاتیں کرتے کرتے اور دروازے پیس آکھڑے ہوئے تھے۔ سوچ نسلک آیا تھا۔  
"یہاں سے چار کوس پر ہے؟" اسد نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں۔ دُور ہے۔ مگر اس کے آس پاس چتنے گاؤں ہیں اُن میں ہر ایک سے چار کوس پر دافع ہے۔  
جیسے زمین ناپ کرنا یا ہر کسی حکیم کی خدمت ہے ہے؟"  
"نہیں۔ ایک شخص اور صحری بُریوں کا کاربار کیا کرنا تھا۔ اُس کی عورت ہے۔"  
اسد کے دل میں دُور کہیں ایک کھنکا سا ہرا، اور اُسے حیرت ہوئی کہ قید میں اُس کی جگہ لینے والے آہنی  
کا کھنکا بھی دہاں موجود تھا۔

سلمنے والے پہاڑ سے سوچ رج اونچا ہو گیا تھا اور صبح سیرے کی دھوپ اُن کی اپنی پہاڑی کی پُشت  
پر پڑ رہی تھی۔ جہاں پر وہ کھڑے تھے ماں سے اُن کی دکشناں دھلان نیچے ایک ننگ کتی میں جا کر ختم ہوتی تھی۔  
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روشنی اور ننگ کی ایک وسیع چادر نیزی سے فتنی ہوئی جا کر سامنے والے پہاڑ کی سیاہ سگودی  
ویوار کے دل میں کھبٹگئی ہے۔ پہاڑی پر دُور کل پانچ یا چھوٹا مکان تھے جن میں سے پیشتر کے گرد چھوڑ رہے  
بھروس کی ادعیٰ ویواریں تھیں اور اُن کی حدود کے اندر اور باہر دُور، ایک ایک نخنے نخنے کیاری نامکیت  
تھے، یہ کیتھی چپکو ریوانی کھیتیں کے برعکس تکونے، پانچ کرنے اور ایسی ہی مختلف بے قاعدہ شکلوں کے تھے۔  
اُس وقت دُور سے انہیں دیکھ کر اسد کو اچانک خیال آیا کہ رات کو گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے اُسے فضائیں جس  
بے ترقی کا حسکس ہوا تھا وہ اس زمین سے پیدا ہوئی تھی۔ اس زمین کی شکل تعمیر کرنا آدمی کے ماتھے میں نہیں سمجھا۔  
یہاں اس کی جو شکل و تنیاب ہوتی تھی، زندگی وہی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ دہاں کھڑے کھڑے اُسے وہ میرٹھا  
میرٹھا گھر ناکرہ، بُری جھی عورت کی کبریٰ شکل، لُٹن پھوٹن بُریوں والے پہاڑ، تڑے تڑے کیتھ اور کچھے ہوئے  
راتے، فطرت کے یعنی مطابق اور مناسب معلوم ہوئے۔ اُس کی سائنس اب آہنہ آہنہ دُست ہو چلی تھی۔  
ریاضن اُس کے لیے کھڑیاں کاٹنے کے اوزارے آیا تھا۔ ایک کھڑا، اور رستے کا ایک جال۔

"سوکھی کڑیاں اور صحراء کھرے کو کھنی کرتے رہو۔ دس بارہ آنے تک لداہک جاتا ہے۔ بعد میں شاید  
کھروں میں نوکری مل جائے۔ قسمت کی بات ہے۔ ذکر ہی میں قائمے بھی ہیں، نقصان بھی ہیں۔ بُخیر، بعد میں جو  
فیصلہ ہو۔ زخمی یہ کام شروع کر دے۔ سب سے اچھا کام ہے۔" ریاضن اُس کو ایک رستی کی بنی ہوئی چل دیتے  
ہوئے بولا، "یہ چلپی اس علاقے کے ول سطے رجھی ہے۔ وہ جو تھا اُمار دو چلپی کا تلاگہ تھے دار ہے، پھر وہ پر

چلنے کے کام آتا ہے۔ تھکا دٹ بھی نہیں ہوتی۔ پہلے فرائند لگئے گی، پھر پیر کے ہو جائیں گے۔ ”  
ریاض نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ چاکے گھر سے کھاپل آیا ہے۔

”کھاپی آیا ہوں۔ کھاپی آیا ہوں۔ کیا کھاپی آئے ہو ہے دو بولی،“ رہاں کیا ملتا ہے۔ چاکے پیا لے ہے مارک  
بادم ترکھانا ہے آپ، اور دوسروں کو دیتا ہے چاکے پیا لے۔ اپنی پیوی تک کو بخوب کا ملتا ہے۔ میں کہنی ہوں  
خیر، تمہدا پرچاہ ہے، اور تمہارا کون ہے۔ مگر تم جوان ہو رہے ہو۔ دوڑھ کے پیروں کی بنے گانمہارا۔ گھٹے میں نے اپنے  
یہے تو نہیں رکھی۔ تمہارے باپ کی تھی، اب تمہاری ہے؛ وہ اسدی بانیہ مڑکر بولی، ”اصل گائے ہے۔  
بُرھی ہو گئی ہے مگر دو دھنہیں سکھایا۔ ہماری خزدشت کے یہے اب بھی دے دیتی ہے۔“ وہ پھر ریاض سے  
محاطب ہوئی، ”علیٰ نے بھی پیا ہے۔ میں نے شہید نکال کر دی ہے۔ اس کو سافس کا مرض ہے۔ میں نے بتایا ہے  
اس مرغ سے کوئی نہیں مرتا۔ تمہارے باپ کو بھی تھا۔ تو پیو، مجھے جاؤ۔“

ریاض نے دو دھن کا گلاس لے کر یہی طرف رکھ دیا اور اپنا بال اٹھا کر اس کی دوڑھی ہمنی رسینوں کو گانمہیں  
دینے لگا۔ اس کی ماں چند لمحوں تک پانے ماندھ کر پر رکھتے، سرزنش کے ماذاز میں کھڑی اسے دیکھتی رہی، پھر بالوں ہر  
کر مسرد فیست سے اوھر اور پھر نے ٹگی۔ اس نے بیان کر پہلی بار دن کی روشنی میں قریب سے دیکھا۔ پھلو لے ہوئے  
نحسنوں اور علام نظریوں والا چہرہ، ہبھے دیکھ کر پھیل رات کر اسد کو محسوس ہوا تھا کہ جیسے کسی نے دو یہی مختلف  
چہروں کے نقش رکے کر اس یہی چہرے میں جمع کر دیا ہو، اب اسے ایک عام کشمیری مردوار کا چہرہ دکھانی دیا۔  
اس نے خیال کیا کہ اس سے پہلے، شاید اسی جگہ پہنچے کے، اسی طور، اس لڑکے کا باپ اپنی مشقت کا صد، کم کی  
ایک مرٹی اور دو دھن کا یہی گلاس دصوں کرتا ہو گا۔ اس کا چہرہ بھی اسی شکل کا ہو گا۔ مبے قاعدہ، خالق کرنے والا،  
اوہ معمر! اور اس سے پہلے اس کے باپ کا، اور اس کے باپ کا۔ اس نے سرور کر کرے میں تظر دوزائی۔ اس  
روان دوان و راشت کے درمیان جبریت ناک طور پر اپنا ترازن قائم کیے، یہ لوگ غسلی کے ایک ہی صفت میں ہے  
کھڑے تھے۔ یہ لڑکا، اس نے سوپا، اس ترازن کو توڑا چاہتا ہے۔ اس لڑکے کے اندر ایک خواہش حرکت کر رہی  
ہے اور اس حرکت کو شاید یہ سمجھتا بھی نہیں، ہر لپٹے خون میں اس کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ ذوق غذائی کی طویل  
تقریزوں کے باوجود جس بات کی سمجھ اس کو زانی تھی، اس کو دندے میں بیٹھے بلٹھے خود پخود وہ بات اس کے دل میں کھلنے  
لگی۔ اس وقت پہلی بار اسد کو محسوس ہوا کہ اس کے، اور اس بے سمجھ اور پر خدا کے کے درمیان ایک بڑا سطہ رشتہ  
ہے۔ اس نے اپنی چپل اتمار کر ریاض کی دی ہوئی سترے کی چپل پہن لی اور ریاض کے ساتھ ہی انہ کر باہر نکل دیا۔  
پہاڑ کے سر پر ہمیں گھر مندوں کی مانند ساتھ ساتھ رکھی کئی پہاڑیوں کی گرتی اور اٹھتی ہوئی، تو نہ پھوٹی بیکر

دُرستک چل گئی تھی۔ آہستہ آہستہ پلتے ہوئے جب وہ دو بھائیوں کو عبور کر کے تیسری کے دہن میں پہنچے تو سورج سر پر آپ کا تھا۔ وہ دو نوں ایک چنان کے سایے میں جا پہنچے۔ دہن سے انہیں اپنی گائے ہجوان کے عقب میں چل آ رہی تھی، پھر پہنچا تھا۔ وہ دو نوں ایک چرانی کے قریب گھاس پر منہ مالتی ہوئی دکھانی دے رہی تھی۔

”اس دُجہری کے پیچے مرک جاتی ہے۔“ ریاض اسکے اشارہ کر کے بولا، ”مرک کے دو نوں طرف کی پہنچے ہے۔ ایک کو سن لک جاتا ہے۔ اس طرف ہادر ہے۔“ اس نے دُجہری جانب اشارہ کیا، بیان سے فوج آتی جاتی ہے۔ بھی بڑی مرک ہے۔ تمہارے پاس نقش ہے ہے۔“

اس نے جلدی سے اپنی تیہیں ٹولیں، پھر صورتیت سے بولا: ”گھر رہ گیا ہے۔“ ریاض اس کا مذاق تجوہ کر نہیں پڑا۔ اسد کی نظریں اس کے چہرے پر لگی تھیں۔ اس نے پہلی بار ریاض کو سنتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ریاض کا چہرہ بدل گیا تھا۔ ایک لمبے کے تہسم نے اس چہرے کے چہرے ہوئے نقش کو گرا کیا جان کر دیا تھا، جیسے کہ ان کے عقب میں کوئی پرشیدہ مقام ہر جس پہ بس اسی قدر ناک دباؤ سے کھٹ کر کے چہرے کے نقش اپنی اپنی مناسب جگہ پر اٹھیرے ہوں اور ان کا کھریا بُرا در بیٹھا نہیں واپس مل گیا ہو۔ ریاض کے چہرے کو اس طور پر لئے دیکھ کر اسد کے دل کو ایک بنے نام سی آسودگی کا احساس ہوا، جیسے اس کے اپنے امداد کی حصے میں ربط کافی تھا۔ پیدا ہو گیا ہر اور ریاض کے مثبت کم چہرے نے اس کے ایک چھوٹے سے کونے کو پکڑ کر اسے سیدھا کر دیا ہو۔

”میرا مطلب ہے۔“ ریاض بولا، ”تمہیں بادا ہے؟“

”ہاں۔ میں اس علاقے کو جانتا ہوں۔“ اس نے کہا، ”نقش کی مزروعت نہیں۔“

”کیسے؟“

”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں پہلے بیان آپ کا ہوں۔“

”کب؟“

”ایک سورس پہلے۔“ اس بولا، ”تمہیں پتا ہے کہ کی کی پشت پہلے کے واقعات ہمارے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔“

”نہیں؟“ ریاض کے چہرے پر گرگر کے آثار تھے۔ ”علی۔“ اس نے بات بدلتی، ”جیب میں دس بارہ آنے ہر وقت ہونے چاہیں۔ لکڑیاں نہ بھکن بخ کر اور ثبوت موجود ہو۔ بھی کبھی کبھی پڑ کر خواہ مخراہ ملاشی لے لیتے ہیں۔“ اس کا جی کر راتھا کہ دوڑا کا بننے، یا کوئی اور بات کرے۔ اس کے چہرے پر حیرت یا تہمس پا پیش نہ

کے آثار ہوں۔ وہ اُس کے ساتھ اپنے آپ کی، کھنڈرے ہن کی، دوستی کی، وقت گزاری کی بانیں کرے۔  
”ہو سکتا ہے“، اس نے کہا، ”کہ جو دلپشت پہلے ہیرے آباء میں سے کوئی یہاں پر رہا ہو، یا ادھر سے  
گزر ہو۔“

”ریاض ہے“، اس نے کہا، ”خیر لگائے تھے اسے ساتھ مل جائے گی۔ اہل ہے۔ دن ڈھلنے  
سے پہلے شہر آ جانا۔“

”تم کیا کرتے ہو؟“ اخراج نے پوچھا۔

”ادھر ادھر کے کام“، ریاض راں سے اٹھا ہوا بولا۔

وہ پھاڑی کے دہن کے ساتھ چلتا ہوا پھر دل میں غائب ہو گی۔ اس دل میں بیٹھا اُس پھاڑی کو دیکھتا  
را جس کے پیچے سے سڑک جاتی تھی اور فوج کا پڑاؤ تھا۔ اس کا دل پھر خالی ہونے لگا تھا۔ اس نے سورج کے مقابل  
انگھیں انھار لگائے کو دیکھا جو آہتہ نیچے آتی، اربی تھی۔ ان پڑھتر پھاریوں کے پیچے، اس نے دیلانی سے  
سرچا، اب اسے یک عزیز ببر کرنا تھا۔ اس عرصے کا اختیار اُس نے اپنے ہاتھ سے کھکتا ہوا حسر کیا۔ یا سین کا تسم  
چہرہ ایک لمحے کے لیے اُس کی انگھیوں کے سامنے سے گزرا جس کے سارے نقش بکب ہان تھے۔



”ویکے چل رہی، گرد جائے گی، چل چل۔ اب کھڑی کیوں ہو گئی ہے؟ یہ ساری عمر ان پھاروں میں دھکے کا ت  
رہی ہے، اب چلنا بھی نہیں آتا؟ تجویز سے تو بکریاں اچھی ہیں۔ اب کیوں کھڑی ہو ہے گرد جانے کو دل نہیں کرتا؟ ہریں ہیں  
ہریں.....“

گئے کام سندھی تھا اور وہ اپنے لبڑا بے تاثر نہ اٹھائے بے بھی سے اسے دیکھتی۔ اور انگھیں ختم کیے ہوئے  
ہمیں اڑیگتی جا رہی تھی۔ سورج سر پر آچکا تھا اور اب گھر نہ کا وقت تھا۔ اس سندھی کے لگھے میں پھٹا ہوا تسری پڑے  
اے کھینچتا ہوا اپس روٹ رہا تھا۔ وہ سڑک کے آس حصے سے گزر رہے تھے۔ بہاں دوسرے گزارے پر ایسی خادار  
تارکی باڑ سڑک کے ساتھ ساتھ دوڑ تک پڑتی تھی۔ باڑ کے دوسری طرف ایک میدان میں جس کے اوپر دیسپروں فوجی

گھاڑیاں سیدھی قطایروں میں کھڑی تھیں، چند فوجی جوان بیانیں اور نیکریں پہنچے والی بال کھیل رہے تھے۔

”علی علی علی!“ اسد نے سرزنش کی۔ ”سندھی؟ کوڑ مغز۔ روز بیٹا توں سیرا ہام اسہ ہے۔ علی نہیں۔

اسد کیم سنا ہے علی کرتی رہتی ہو۔ چلو چلو چلو۔“

گائے نے مذکور لے بغیر مختصر سی بیک کر کے جواب دیا۔ دودھ پنیر اور گوشت کے خالی دبر، شراب کی خلا برتاؤ اور پھنسنے پڑنے کی طرف ساری سے اٹی ہٹی زمین پر وہ دلوں پھٹے پھلتے ہوئے کچھ دوزک سڑک کے ساتھ ساتھ پلتے رہے۔ پھر دہاں سے ایک پہاڑی راستے پر اتر کر گھر کی جانب ہوئے۔ روز مرہ کی طرح اسد نے چند مسحول اور حرا اور حرکی باتیں ذہن نشین کر لی تھیں۔ اس کی پشت پر لگتا ہوا جھولا چھوڑی بڑی خشک لکڑیں سے ایک چھٹا بھرا تھا۔ ان لکڑیوں میں سے ایک پر جس کی چھال نرم اور جھوارتی، چند الٹی سیدھی مہین کیلیں کیلیں پڑی تھیں جو اسے یادداشت کے طور پر ناخن سے اس پہ بناٹی تھیں۔ اس کا صبح بھر کا کام ختم ہو چکا تھا۔

گھر کی پچھلی دیوار میں سے بننے ہوئے گائے کے مخصوص ہمارا راستے کی طرف سے اسد گھر پہنچا۔

گائے کو باذھ کر اس نے ریاض کی ماں سے روٹی لے کر کھائی، پھر جھولا اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور شہر کی جانب پڑا۔ ماں تک پہنچتے پہنچتے اس کا جھولا بھر گیا، مگر اس طرح کر ناخن کی لکڑیں والی لکڑی جمیٹ اور پر رہی بسوچ نے یمن پر تھائی آسمان سر کر لیا تھا۔ قصبے میں داخل ہونے ہوئے وہ جگہ جگہ پرستاشی نظر وں سے دیکھتا گیا۔ ریاض اس کو کہیں پہ نظر نہ آیا۔ یمن چار مقام پر اس کو دافت چہرے نظر کئے جن سے اس کی سرسری سلام علیک ہٹی۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے وہ کسی نہ کسی دفت پر مل جپکا تھا۔ کبھی ایک کے گھر، کبھی دوسرے کے گھر، دو دو یمن میں کے گردہوں میں، کسی دکان پر یا طوبیلے میں۔ ہر دوسری یا تیسری سرپر کو یا شام میں، چائے کے پیالوں اور کڑو کے کشیری تماکو کے دھوپی کے غبار میں، لا لیٹنیوں کی دھم روشی میں باہم کرتے ہوئے اور نکلنے ہوئے۔ زیادہ تر سُنستہ ہوئے۔ اس نے یہیں اجنبی چہروں سے واقفیت حاصل کی تھی، ایسے چہرے جن میں سے میشر کی اس کو سرف انگھ کی سچان تھی، نام اس کے حافظے سے نکل چکے تھے۔ ہر روز یا دوسرے دن پہنچنے بوجھ سے چھٹکارا عامل کرنے کے بعد شہر میں کسی جگہ پر بیاض سے اس کی ملاقات ہو جاتی۔ ماں سے وہ چلتے پھرتنے ہوئے کسی جگہ پر جا پہنچتے۔ اس آبادی میں ایسی چلہ پانچ گھنیں موجود تھیں جن کے مالک بظاہر پندرہ مول یعنی کوتیار تھے۔ دہاں پر پھر ایک ایک دو دو کر کے دگ آتے۔ نوجوان، او جیر سعمر، بوڑھے۔ کوئی کوئی پتوں کو ہمراہ لیتے ہوئے ترکیوں کوگ دہاں کھنڈہ اور گندہ رکتے، چائے کے پکی ہوتی تو پیا رہتی، حال احوال پوچھتے، او حصہ اور حرکی باتیں کرتے، اور اٹھ کر چلے جاتے۔ باتیں عموماً روز مرہ کی، شلوٹی دہرت کی، پھاری و پیدا افس کی، کمالی اور افلس کی ہتھیں۔ بہراچھی بڑی بات کا اختتام خدا کے

شکر پڑتا۔ پیچ پیچ میں ملکی حادثت کی، سیاست اور جنگ کی بات بھی آجاتی۔ اسے، علی کے رد پر میں میٹھا ان کی  
لائیں سنتا، بیشتر وقت ان کے خیالات کی رو جانپنا، مددوں حاصل کر کے انہیں دعائے کے کروں میں ذخیرہ کرتا، اور کبھی  
کبھی پیچ میں گفتگو کر ایک خاص پیچ پر لانے کی خاطر کرنی ایک اور بات مشیاری سے، اختیارات سے، کسی خاص زادیے  
سے کر دیتا۔ اس زمانے میں پہلی بار وہ دوسرے لوگوں کے خیالات، ان کے احساسات، ان کے ردیے کو کشید  
کرنے کے امداد سیکھ راتھا۔ چند میتھوں کی جسمانی محنت اور بہت خلیے کی مخصوص آبہ ہرانے اس کی صحت پر اچھا شد  
کیا تھا۔ اس کا سینہ صاف ہو گیا تھا اور کئی ہفتوں سے اس کی سانس خراب نہ ہوئی تھی روز مرد کے طویل پہاڑی سفر اور جنگ  
پھلوں اور وودھ کی خداک نے اس کی کمر اور ڈانگوں کو مضبوط بنایا تھا اور کچھ عرصہ پہلے اس کے دن نے جربہ ملکی ہی تھی<sup>۱</sup>  
اس کے اثرات عامب ہرنے جا رہے تھے۔ صرف اس کی روح پر کہیں کہیں اس کے نشان ابھی باقی تھے۔ ان گھر میں  
کے چھوٹے چھوٹے نہ صدمہ کروں میں سیدھے سادے، مندرجہ الحال مزدوروں، مسجد کے دروازوں، طالب علموں  
و کامداروں کے ساتھ جب وہ میٹھا، یہ جانتے ہوئے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مخبر ہو سکتا ہے، اس کیلئے کامیک  
وار میں غازی کر سکتا ہے، بس کامیک بار کو اڑ گھلنے کی دیر ہے اور ٹران۔۔۔ اس جیتنے جد گئے ہوئے ہر دم حاضر  
خطرے کا حس سیلے جب وہ ان کے ہمراہ میٹھا اور رقصاؤ نہ کی مختصر سی بات کر کے گفتگو کے وحدے کو اپنی  
خواہش کے مطابق روایت کرتا، تو اس کے اندر اترے ہوئے بید کے ان نشافوں پر میٹھا میٹھا درد ہوتا اور اس کے دل  
میں ایک عجیب نش آور قوت کا حس پیدا ہوتا۔ یہ علاقہ اس کی عمر کے ایک دو کل مانند تھا جس میں وہ نیم رضاہی  
سے منیں بکھر عمدہ اور جمل ہوا تھا اور اس کی تگ و دو سے کم و بیش نصف اندر ہو رہا تھا۔

ماہم قدم قدم پر اس کے دل کی قید کے آثار ابھی قائم تھے۔ خوشی محمد کے جرم اور سزا کا تصور اس کے ذہن  
کو، اور یا سین کی بیو اس کے دل کو دھکتے دینتی تھی۔ اور اپنے کام کے عنابر سے اس تدریشتاسائی حاصل کرنے کے باوجود  
وہ اس علاطے کے سرد پا کر محض بیاض کی ماوس شبیہہ کے داسٹے سے پہچانتا تھا۔ اس بے نش سرزمین پر وہ اول د  
آفریک اجنی سافرتھا، چنانچہ اس روز جب ریاض اسے نظر نہ آیا تو وہ اپنی پشت پر کڑیوں کا گھنی اٹھانے اٹھانے  
بازار سے گزر گیا۔ اس کو کوئی ٹھاکر نہ بلتا۔ کوئی ٹھاکر مل جاتا تر چارچھ آنے زیادہ مل جایا کرتے۔ پھر وہ کڑیاں کاہک  
کے گھر چھوڑنے کے لیے جاتا۔ کڑیاں پھینک کر وہ پنیے کے لیے پانی مانگتا اور اسی بہانے پر چند منٹ تک کر دو چار بائیں  
کر لیتا۔

ٹھاکر سے یوں ہو کر اس نے کڑیوں کے ٹال پر پانی ٹھا جاگرایا۔ وہاں سے اسے جو اونے پونے دام بلے اس  
نے جیب میں ڈالے اور ناخن کے نشان والی کڑی کھٹے سے پھنس کر چھڑی کے طور پر تھیں لٹکانے والیں ہو لیا۔ والیں

آتئے ہوئے راستے میں اُخْرِ ایک تمباکو دلے کی دکان کے اندر پیاسن اس کو نظر پڑا۔ لمبی اور تگ گلی نما دکان کے نیم نزدیک  
میں پنڈ لوگ دیوار کے ساتھ چائی پر بیٹھے تمباکو پر ہے تھے۔ اسد جاگر اُن کے پاس زین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد  
دو آدمی اور ایک بچہ اٹھا کر چلے گئے تو وہاں پر ریاض اور اسد کے علاوہ صرف ایک اور شخص بیٹھا رہا گیا۔ دکاندار اٹھا  
اور انہیں چھوڑ کر باہر دکان کے سامنے ہوئے ہوئے سُول پر ہاٹھیا۔ جب وہ سُول پر بیٹھ کر حلقے کے دو کش لگا چکا  
تو اُس نے دکان کے اندر کی طرف منہ کر کے نمباکو کا دھواں چھوڑا۔ ریاض کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کر نہ اٹھا کر  
شوار میں اڑسا ہوا ایک اخبار نکالا۔ یہ اُس روز کا چھپا ہوا ایک کشیری روز نامہ تھا۔ یہ تمازوہ اخبار اس بات کی علامت  
تھا کہ یہ شخص اُسی روز سرحد پار کے لیے روانہ ہونے والا تھا اور اخبار کو ثبوت کے طور ساتھ لے جا رہا تھا۔ اخبار کے  
پہلے صفحے پر نیلے اخباری نگار میں جسی ہوئی چند ٹہری ٹہری تصویریں تھیں۔ اسد نے جلد جلد اخبار کے ورق اٹھا کر  
وہ سرے ہاتھ کی ٹھیکیوں سے بیٹھے کی مردی کے اندر چھپائی ہوئی چھوٹی سی دو ٹکنی پسل کو جھک کر باہر نکالتے لگا۔ اخبار  
کے ایک اندر دی صفحے پر اُسی نیلے نگار میں ایک اٹھاڑ چھپا تھا۔ اسد نے پسل کا نیلا سکھ اٹھاڑ کل بکلی نیلی زین پر جھایا  
اور کمزی کے ٹکڑے پر سے دیکھ کر اُسی شکل کی لکیریں لکھنے لگا۔ اس طرح سے کہ پہلی نظر میں دیکھنے پر نظر آئیں، مگر  
غزر سے دیکھنے پر ان کا نقش صاف دکھائی دے جائے۔ یہ کام ختم کر کے اُس نے اخبار دوسرے شخص کے حوالے کیا  
اور اپنی پسل دوبارہ نیفے کے سو راخ میں ڈال کر دُو تک کھسکا دی۔ دوسرے شخص نے اخبار کو تہہ کر کے اُسے  
شوار میں اڑسا اور کوئی بات کیے بغیر اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اسد نے کمزی کو تزیز کر اُس کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے  
بیکے اور اُن کو اتحدوں میں بھر کر دکان کے باہر لے آیا۔ وہاں پر اُس نے انہیں زین پر ایک چھوٹی سی دھیری کی  
شکل میں ترتیب دیا اور دکان والے سے اچسے کر اسے آگ لگادی۔ جب کمزی جلنی ختم ہو گئی اور کٹھے دیکھنے  
لگئے تو دکاندار نے حلقے کی ٹوپی اٹھا لی، اُس میں تمازوہ تمباکو دھرا اور اُس پر کوئے جا کر کش لگانے لگا۔ اسی دوران  
میں غلام اُن سے آملا تھا۔ وہ اور ریاض بیٹیں کر رہے تھے۔ جب حلقہ چالو ہو گیا تو چاروں نے بارہی بارہی اس پر ش  
لگانے شروع کیے۔ دو دو کش لگانے کے بعد اُن ٹینوں نے دکان والے کو الوداع کہی اور چل پڑے۔

”علی۔“ ریاض نے قبے سے نکل کر کہا، ”قم گھر چلے جاؤ۔ میں غلام کے ساتھ چاہا ہوں۔“

”کہاں؟“ اسد نے پوچھا۔

”کام ہے۔“ ریاض بولا۔ ”میں آجائوں گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ اسد نے کہا۔

”ریاض اور غلام نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ریاض بولا۔ ”آجائو۔“

وہ تینوں سرک کی جانب ہوئے۔ راتے ہیں ریاض اور غلام نے لکڑیاں انھا انھا کر پانے جھوڑوں میں والی شروع کر دیں۔ اسہ آن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

”غلام کو لکڑیاں چاہیں۔“ ریاض نے کہا، اس کے گھر بھیکتے جائیں گے۔“

غلام کا گھر سرک سے ذرا بہت کے تھا۔ اسہ بھی لکڑیاں توڑ توڑ کر جھولے ہیں جھرنے لگا۔

اب سورج خوب ہر رات تھا۔ دھوپ دیر ہرلی سرک سے جا چکی تھی مگر پہاروں کی چوٹیاں بھی چک رہی تھیں۔ تینوں آدمی لکڑیوں سے بھرے جھولے پشت پہ انھائے کشیری مزدوروں کے اذاز میں جھکے جھکے ایک قطار میں سرک کے کنارے پلے جا رہے تھے۔ ایک مقام پر اک ان کی لفٹگر کچھ چڑھائی، کچھ تھکا دٹ کی وجہ سے تمم گئی تھی اور وہ کندھ سے کندھا لگائے چلتے چلتے بکھر کر ایک دوسرا کے پیچے چلنے لگے تھے کبھی کبھی کوئی فوجی جیپ پاٹھی گاڑی آن کے پاس سے گزر جاتی تھی۔ ہر ایک گاڑی کی آواز کو قریب آتے سن کر وہ رُک جاتے اور گاڑی کو متنه انھا کر دیکھنے لگتے۔ جب تک کہ وہ گزر جاتی۔ پھر وہ چل پڑتے۔ آگے آگے غلام جا راتھا، اس کے پیچے ریاض، اور سب سے پیچے اس تھا۔ سرک پر دُور دُور تک کریں اور وکھافی زدے راتھا۔ غلام اور ریاض نے سروں پر کشیری کرھائی کے پڑسکل کھوڑپی نافرپای پہن رکھی تھیں۔ اسہ نگکے ساتھا۔ دن کی روشنی تیزی سے معلوم ہرلی جا رہی تھی، مگر ابھی اتنی باقی تھی کہ میں تھیں قدم تک باری نظر جاتی تھی۔ سرک کی بلکل طویل چڑھائی پر چڑھتے اسہ کو ایک لمحے کے پیسے پوں محکوس ہوا جیسے وہ اس قطار سے بکھل کر سامنے والے پہار کی چوٹی پر جا کھڑا ہوا ہے اور دوسرے ان تینوں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ بے دخل کی کس کیفیت سے اب دو ماں اس ہوتا جا راتھا۔ اس کیفیت نے اسے اس قابلِ بنا دیا تھا کہ وہ پیسے نظاروں کو پوں دیکھ کر چھے اپنی انکھ سے دیکھ رہا ہے۔ پہار کی پہنچ چوٹی پر کھڑے کھڑے اسے دوسری پیچے اس گھری اور خالی سر زمین پر جھلک ہوئی بیکار چاپل سے چلتے ہوئے تھے میں بوجھ بروار خود رک کا پہر قافلہ طویل لھمرا اور ماں اس معلوم ہوا۔

اب کچھ دیر سے اسہ محکوس کرنے لگا تھا کہ اس کے دوسرے ساتھیوں کی چاپل میں کچھ تبدیلی آپنی تھی۔ گاڑیوں کی آوازوں پر دہ بدک کر رُک جاتے، پھر ایک دوسرا کو دیکھ کر چل پڑتے۔ اسہ آن کے ساتھ ساتھ رکنا اور چلتا رہا۔ ایک گاڑی کے سخن کی آواز اُن تیوں دوسرے ہی رُک گئے۔ قریب آنے پر انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک درہ بیانے سائز کا گھلا فوجی رُک تھا جسے دو فوجی چلا رہے تھے۔ رُک میں اور کوئی نہ تھا، جب رُک پندرہ قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو اچانک غلام نے باختہ انھا کر اسے تکنے بجا اشارہ کیا۔ دریبور نے ایک یکنہ کے وقفع کے بعد ایک لگائی اور رُک رکنا رکنا آن سے چند قدم آگئے نکل کر جا ٹھہرا۔ فوجی نے کھڑکی سے سر نکال کر ٹیچھے دیکھا۔ چند